© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسان پر انسان کی خدائی کی یوں تو متعدد صورتیں ہیں مگر اسے قائم کرنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ خدائی قائم کرنے والا لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرے کہ وہ بعض ایسی خصوصیات کا حامل ہے جن کی بنا پر اُسے "اَنَا رَبُّکُم" کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے۔ خدائی قائم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے حیوان بنایا جائے، داخلی طور پر اُسے منضبط کرنے والے جتنے اخلاقی محرّکات ہیں انہیں ختم کیا جائے، اس کے سفلی جذبات کو بھڑکایا جائے اور وہ جب بپھر کر معاشرے کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے لگے اور عوام کے لیے پُرامن طور پر جینا دوبھر کر دے تو پھر بے رحم قانونی شکنجوں کے ذریعے اُسے کسی نظم و ضبط کا پابند بنایا جائے۔

دورِ جدید کی پوری تاریخ انسان پر انسان کی خدائی کے اِسی دوسرے طریق کے بے شمار شواہد پیش کرتی ہے۔ نشأۃ ثانیہ (RENAISSANCE) نے لوگوں کے افکار و نظریات کے اندر تلاطم بپا کر کے جب اُن کے مذہبی جمود کو توڑا تو اسی جنون میں لوگوں نے اُن داخلی محرّکات کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جو انسان کو اندر سے کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند بنائے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حریتِ افکار کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر چھپی ہوئی حیوانیت بھی بے قابو ہونے لگی۔ اس چیز کو لوگوں نے "آزادی کی برکات" خیال کیا اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات پر غور کرنے کے بجائے اس کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنے لگے۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ آزادی کس قسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خوفناک نتائج پیدا کرے گی اور مذہب اور روایات کے جن بندھنوں کو توڑنے پر لوگ اُس وقت بڑے خوش نظر آتے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ اِن کے بدلے میں انہیں نہ صرف آمریت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالنا پڑے گا بلکہ اپنے آپ کو بے شمار قانونی شکنجوں میں کسوا کر زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

انسانی زندگی پر جب ذرا گہری نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر حیوانیت اور روحانیت دونوں اس طرح ایک دوسری میں سموئی ہوتی ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ روحانیت یا اخلاقی احساس انسان کی تہذیب کرتا ہے اور اس کی حیواتی قوت کو کسی صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ چونکہ انسان کی حیوانی خواہشات پر انسانی بقا کا دارومدار ہے اس لیے ان میں غیر معمولی قوت ودیعت کر دی گئی ہے۔ اب اگر ان قوتوں کو داخلی طور پر اپنی فطری حدود کے اندر رکھنے کا انتظام نہ کیا جائے تو یہ سرکش اور باغی ہو کر نہ صرف فرد کی زندگی کو برباد کر دیتی ہیں بلکہ پُورے معاشرے کو تہ وبالا کر ڈالتی ہیں۔ اس لیے اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے جکڑ بندی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ آمرانہ جکڑ بندیاں ہر اُس نظام کا ناگزیر حصہ ہیں جس کی بنیاد الحاد پر اٹھائی گئی ہو خواہ یہ نظام سرمایہ دارانہ جمہوریت ہو، فسطائیت ہو یا اشتراکیت

سطح بین آنکھیں ممکن ہے ان تینوں نظاموں کی جکڑ بندیوں میں کوئی نوعی فرق دیکھتی ہوں، مگر حقیقت میں ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ نوعی نہیں بلکہ ارتقاء کی مختلف منازل کا ہے مثلاً جدید سرمایہ داری کے آغاز میں اگرچہ دولت پرستی نے مذہبی اقدار کو انسانوں کی نظر میں بے وزن بنا دیا تھا مگر معاشرے میں مستحمد روایات کا احترام کسی حد تک موجود تھا اور شریف لوگ اُن روایات کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے عام انسان اندر سے اتنا بے قابو نہ ہونے پایا تھا جتنا کہ آگے چل کر ہو گیا۔ اخلاقی ضابطۂ حیات سے بغاوت کا جو رجحان آغاز میں اُبھرا تھا اس نے رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کی کہ وہ اپنے ساتھ روایات کو بھی بہالے گیا۔ لوگوں نے روایات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو بھی بیکار کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنا شروع کیا اور اس طرح پورا معاشرہ ہمہ گیر فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ آخر کار یہ محسوس ہونے لگا کہ انسانوں کی اس سرکشی کو فسطائیت کا آہنی نظام ہی روک سکتا ہے، چنانچہ یورپ کے مختلف ممالک میں فسطائیت نے اپنا تسلط قائم کیا۔

یورپ میں مذہب کے خلاف بغاوت کی شدید لہر پروٹسٹنٹ تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی۔ عام لوگ اس تحریک کو ایک ایسی مذہبی تحریک خیال کرتے تھے جس کا مقصد رومن کیتھولک مذہب کے جمود کو توڑنا اور اس کے اندر جمع شدہ غلاظتوں کو صاف کرنا تھا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ پروٹسٹنٹ تحریک اصلاحِ مذہب کی کوئی تحریک نہیں تھی بلکہ مذہب سے انحراف اور بغاوت کا ایک زبردست رجحان تھا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے وہی حربے اختیار کیے جو عام طور پر اس سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اہلِ مذہب کے جمود اور ان کی بداعمالیوں کے افسانے گھڑے گئے اور انہیں بڑی شدت کے ساتھ عوام میں پھیلایا گیا۔ پھر حقیقی مذہب کی تعریف کی گئی اور اس کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا جانے لگا اور لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مذہبی طبقے نے مذہب کی جو حدود و قیود قائم کر رکھی ہیں اور جن اخلاقی پابندیوں کا وہ عوام سے تقاضا کرتا ہے، اصل مذہب کا اُن سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ مذہب تو روشن خیالی اور ترقی پسندی کا نام ہے۔ اس لیے روشن خیالی اور ترقی کے نام پر جو کچھ کر لیا جائے وہی مذہب کا مقصد و مدعا ہے۔ اس قسم کی غلط تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ نہ صرف اہلِ مذہب سے بیزار ہوتے بلکہ مذہب نے اوامر و نواہی کا جو نظام قائم کر رکھا تھا اور خیر و شر کے جو پیمانے انسانیت کو دیئے تھے ان سب کے خلاف حقارت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ روایات کی بھی تذلیل ہونے لگی اور لُطف کی بات یہ ہے کہ فساد کا یہ سارا کھیل مذہب کے نام پر کھیلا گیا۔ "اصلاحِ مذہب" کی ان تحریکات نے آمریت کو جنم دیا۔ جرمنی میں مارٹن لوتھر کی تحریک کے نتیجے میں فسطائیت نے جنم لیا اور انگلستان میں یہ سارا کام بادشاہت کی نگرانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں سرانجام پایا۔ بادشاہت کے زوال کے بعد جب یورپ کے مختلف ممالک میں جمہوریتیں قائم ہوئیں تو وہ بھی انسان پر انسان کی خدائی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ خدا کے بلند و بالا مقام پر وطن اور قوم کو فائز کیا گیا اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنی زندگی میں اگر فائز المرام ہونا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وطن کی خاطر جئیں اور اسی کی خاطر مریں اور اسی کی سربلندی کے لیے جدوجہد کریں۔ ظاہر ہے کہ بے جان وطن جس کی حیثیت ایک بُت کی سی ہے، خود تو فرمان جاری نہیں کر سکتا۔ یہ فرض وہی لوگ سرانجام دیتے ہیں جو اس بُت کے مجاور و محافظ ہوں چنانچہ وطن کی خدمت اور سربلندی کے نام پر ایک عیار طبقہ عوام پر مسلط ہو گیا اور اُس نے اپنی خدائی کا سکہ چلانا شروع کیا۔ انسان کے بنائے ہوئے ضابطوں کو تقدّس کا وہ مقام حاصل ہو گیا جو خدا کے دیئے ہوئے قوانین کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر وطن کی خدائی بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ذرائع نقل و حمل کی حیرت انگیز ترقی نے دنیا کے دُور دراز گوشوں کو سمیٹ کر ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اس سے وطنیت کے تعصبات اور امتیازات ماند پڑنے لگے اور اس بُت میں خُدائی کی جو کشش پیدا کی گئی تھی وہ کمزور ہونے لگی۔

دوسری طرف اخلاقی احساسات کے ختم ہونے سے انسان روز بروز بے قابو ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو وہ اپنی انفرادی زندگی میں اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوا پھر اس نے اجتماعی زندگی میں ایک ایسی مجنونانہ روش اختیار کی جس سے معاشرے میں زبردست بگاڑ پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ ایسے مسائل پیدا ہو گئے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جب تک اجتماعی زندگی کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ جکڑا نہیں جاتا اس وقت تک اس معاشرے کا نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی نئی صورت حال نے اشتراکیت اور اس کی بے رحمانہ جکڑبندیوں کو جنم دیا۔ اخلاقی احساسات کے بغیر انسان محض ایک حیوانِ ناطق ہے۔ حیوان کے لیے تین ہی مسائل ہوتے ہیں۔ مشقت کرنا، پیٹ بھرنا اور تناسل کے سلسلے کو قائم رکھنا۔ اس لیے اسے کسی ضابطے کا پابند بنانے کا یہی آسان راستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ رب بن کر انسان کے رزق کو کنٹرول کر لیا جائے۔ اس کنٹرول سے اس کی پوری زندگی کو جکڑا جا سکتا ہے۔ یہی طریقہ اشتراکیت نے اختیار کیا ہے۔

یورپ میں تو ان چاروں منازل سے گزرنے کے لیے اہلِ یورپ کو تین سو برس لگے ہیں مگر ہمارے ہاں الحاد کی تحریک اس شدت سے اٹھائی گئی ہے کہ ۲۳ سالوں میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری نوجوان نسلیں اس حد تک بے قابو ہو گئیں کہ بڑے سنجیدہ لوگ اس نہج پر سوچنے لگے ہیں کہ کیا اشتراکیت کی جکڑ بندیوں کے سوا ہمیں کوئی دوسرا قانون یا ضابطۂ اخلاق بھی انتشار سے بچا سکتا ہے؟ اب ذرا دین سے انحراف کی ان مختلف منازل پر نگاہ ڈالیے جن کے نتیجے میں اشتراکیت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

پاکستان دین کی اساس پر معرضِ وجود میں آیا اور دینی جذبے سے سرشار ہو کر ہی عوام نے اس کے لیے قربانیاں دیں۔ اس وقت جبکہ عوام کے دینی جذبات و احساسات عروج پر تھے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ملک کا آئین جلد از جلد قرآن و سنّت کی بنیاد پر تیار کر کے اُسے ملک میں رائج کر دیا جاتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ملک کی عام آبادی کا ذہن یکسو ہو جاتا۔ لوگوں کے اخلاقی احساسات، ان کی ملی روایات اور معاشرتی و ملکی ضابطوں کے درمیان کامل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی اور قوم جلد از جلد ترقی کرتی۔ مگر یہ معقول، منصفانہ اور تعمیری طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے اسلامی آئین کی راہ میں مختلف روڑے اٹکائے گئے اور لادینی قوتوں کی پوری طرح ہمت افزائی کی گئی تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں دین کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ انتشار پیدا کیا جائے۔ اس ضمن میں خاص طور پر "ملا" کو ہدفِ تنقید بنایا گیا۔ اس کی جہالت، کم علمی اور دورِ حاضر کے مسائل سے اس کی عدم واقفیت کے عجیب و غریب افسانے تراشے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کی آراء دین میں وزن رکھتی ہیں انہیں مسلم سوسائٹی میں بے وزن بنا دیا جائے اور ان کی جگہ اُن لوگوں کو اُبھارا جائے جو جاہل ہونے کے باوجود مجتہد ہونے کے دعویدار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں اور دین کے اندر ان کی تحریفات کو اچھالا جائے اور سرکاری طور پر اُن کی پذیرائی کی جائے ایس کام کو بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سرانجام دیا گیا۔ اگر ان جاہل مجتہدین کی "تحقیقات" پر غور کیا جائے تو ان سب کا انداز ایک ہے۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اہلِ مغرب اس وقت جس راہ پر گامزن ہیں وہی سلامتی کی راہ ہے اور اسی راہ پر چل کر کوئی قوم فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی مغرب کے معیارِ ترقی کو اپنانا چاہیے۔ پھر اس ضمن میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ سب "مُلّا" کی تنگ نظری اور تعصب کے نتائج ہیں، ورنہ اللہ کا دین بھلا عصرِ جدید کے افکار و نظریات سے کس طرح متصادم ہو سکتا ہے؟ اس باطل خیال کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا جاتا ہے کیونکہ سُنّت ہی سے ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے وہ ڈھانچے ملتے ہیں جنہیں قرآنی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویریں کہا جا سکتا ہے۔ سنّت سے انحراف کے بعد قرآنِ مجید کی من مانی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور کلامِ الٰہی میں تدبر و تفکر کے نام پر ایسے غلط افکار و نظریات کو پیش کیا جاتا ہے جو تعلیماتِ الٰہی کی عین ضد ہیں۔ کہیں قرآنِ مجید سے سُود کا جواز نکالا جا رہا ہے۔ کہیں موسیقی اور بُت تراشی کے لیے دلائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ کہیں خاندانی منصوبہ بندی کی تائید کے لیے آیاتِ قرآنی کا حلیہ بگاڑا جا رہا ہے۔ الغرض تمام وہ بُرائیاں جو مغربی دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح قرآنِ مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کا نام ان لوگوں کے نزدیک تحقیق اور خدمتِ دین ہے۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان نسلوں نے اپنے آپ کو دین کے مطابق ڈھالنے کے بجائے دین کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی بعض سادہ لوح دین کے معاملے میں اس قسم کے انکشافات کو دین کی خدمت خیال کرتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اس اندازِ فکر سے کسی معاشرے کے اندر الحاد پرورش پاتا ہے جب اس مرعوبیت کے انداز پر غور و فکر کرنے والے مفکرین نوجوان نسل کے دل و دماغ میں یہ تاثر بٹھاتے ہیں کہ ترقی اور روشن خیالی کا اصل معیار تو وہی ہے جو مغرب نے دنیا کو دیا ہے اور ہم انہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معیار کو اپنا کر دنیا میں سربلند ہو سکتے ہیں اور اس معیار کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ قرآن مجید میں من مانی تاویلات بلکہ تحریفات کرنے میں متامل نہیں ہوتے تو نوجوانوں کے ذہنوں میں فطری طور پر یہ احساس پیدا ہوگا کہ کیوں نہ اصل معیار کو اپنا لیا جائے اور جس دین کے اندر قدم قدم پر تغیر و تبدل کی ضرورت پیش آرہی ہے اُسے یکسر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اصلاحِ مذہب اور تجدیدِ دین کا یہ انداز اختیار کیا گیا وہاں لوگوں کے اندر دین سے محبت اور رغبت کا رجحان پیدا ہونے کے بجائے انحراف اور بغاوت کا رجحان پیدا ہوا۔ یورپ میں مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ مذہب سے الحاد کو فروغ حاصل ہوا اور ہمارے ہاں اس قسم کی "تحقیقاتی" سرگرمیوں سے نوجوان مذہب سے برگشتہ ہوئے۔

یہاں ایک طرف تو عوام خصوصاً نوجوان نسلوں کو مذہب سے بیگانہ بنانے کی سازشیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا رہا کہ انہیں اخلاقی حدود و قیود سے آزاد کیا جائے اور اسلام نے سیرت و کردار، ضبطِ نفس، عفت اور پاکدامنی کی جو درخشاں روایات قائم کی ہیں ان کے خلاف نفرت و حقارت کا عام رجحان پیدا کیا جائے۔ چنانچہ اخلاقی حدود اور ضبطِ نفس کو انسان پر بے جا دباؤ اور عفت و پاکدامنی کو تاریک خیالی سے تعبیر کیا جانے لگا۔ پھر اسلام نے تقویٰ اور پرہیزگاری کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں ان کی عیب جوئی میں اوراق سیاہ کیے جانے لگے تاکہ ان حضرات کے لیے مسلم معاشرے میں جو جذبۂ احترام موجود ہے وہ کم ہو اور وہ مغربی تصور کے مطابق یہ سمجھنے لگیں کہ انسان فطری طور پر گناہگار ہی ہے مگر اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ خدا خوفی اور خدا ترسی کی نمائش کرتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں انسان کی سرشت کے بارے میں ترقی پسندوں نے جس قدر افسانے لکھے ہیں ان میں انسان کی اس "منافقت" کو نمایاں کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر انسان اندر سے شیطان ہوتا ہے اور وہ محض عوام کو دھوکہ دینے اور انہیں بیوقوف بنانے کے لیے پرہیزگاری کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس لیے بہتر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی ہے کہ ظاہرداری کے سارے پردے چاک کرکے اور ہر قسم کے خوف سے بے پروا ہو کر انسان کھُل کر اپنے سفلی جذبات کی تسکین کرے کیونکہ اس آزاد طرزِ عمل سے ہی انسانی شخصیت کی بہتر طور پر تشکیل ہو سکتی ہے۔

ان جدید "مفکرین" اور "دانشوروں" نے مغربی فلاسفہ کی اندھی تقلید میں اس سادہ سی حقیقت پر غور کرنے سے انکار کر دیا کہ انسان کو فطری طور پر گنہگار قرار دینے اور اس سے بھول چوک میں گناہ سرزد ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں انسان کے بارے میں جو تصور رائج ہے اور جس کی بنیاد پر اس کے لیے اخلاقی اور سیاسی ضابطے مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کے افکار کے سرچشمے اور عمل کے محرکات فطری طور پر سفلی اور مادی ہیں، اس بنا پر وہ جب نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت ایک ملمع سازی ہوتی ہے کیونکہ یہ طرزِ عمل اُس کی اصل فطرت کے خلاف ہے اس لیے جو ضابطۂ حیات اُسے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی دے وہی صحیح اور فطرتِ انسانی کے قریب ہے۔ اسلام کا اساسی تصور انسان کے بارے میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیک اور امین سمجھتا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ انسان سے معاملہ کرتا ہے کہ اگر اُسے پاکیزہ ماحول اور اچھی تربیت میسر آجائے تو وہ شیطان بننے کے بجائے بندۂ رحمان ہوگا۔ اگر اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو یہ اس کی فطرت کا خاصہ نہیں بلکہ اتفاقی لغزش ہے جس کے ارتکاب سے اُس کے اندر خلش پیدا ہوتی ہے اور اس کا ضمیر بوجھ محسوس کرتا ہے۔ اس خلش کو محسوس کرکے وہ اپنی اصلاح کے لیے کوشش کرے تو وہ اپنے اخلاق کو زیادہ سے زیادہ بلندی تک لے جا سکتا ہے۔

انسان کے بارے میں ان دو مختلف نظریات کی وجہ سے جو اجتماعی نظام تشکیل پاتے ہیں وہ بھی بنیادی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جو نظام انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیک اور قابلِ اعتماد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھتا ہے وہ اس کی فطرت اور اس کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوتا بلکہ برابر اصلاح کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اصلاح کے معاملے میں بھی قانونی گرفت پر زیادہ انحصار کرنے کے بجائے تہذیبِ باطن اور تعلیم و تربیت پر زیادہ زور دیتا ہے، کیونکہ اندر کا انسان جب تک مہذب اور اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں ہو جاتا خارجی پابندیاں زیادہ موثر ثابت نہیں ہو سکتیں۔ مگر جو لوگ انسان کو فطری طور پر گناہگار اور ناقابلِ اعتماد حیوان سمجھتے ہیں ان کا زیادہ زور قانونی جکڑبندیوں اور بے رحم ضوابط پر ہوتا ہے اور وہ ان کی مدد سے ہی انسان کو اجتماعی زندگی کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کے فطری طور پر گنہگار ہونے کے تصور کی اگرچہ اسلام پوری طرح نفی کرتا ہے مگر بدقسمتی سے یہاں کے باشندوں کے ساتھ گزشتہ بیس سالوں میں جو سلوک کیا گیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قومی معاملات کو چلانے والے اسی تصور کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ مغرب کی بھونڈی نقالی ہے جس کے ذریعے ہماری نوجوان نسلیں مغربی افکار و نظریات کی تربیت پاتی ہیں اور وہ انسان کے بارے میں وہی عقیدہ لے کر جوان ہوتی ہیں جو اہلِ یورپ کا ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے اور اس کے لیے نفس و جسم کی خواہشات کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس تصور کی بنا پر انسان کو اجتماعی زندگی کا پابند بنانے کی صرف یہی ایک صورت ممکن سمجھی گئی ہے کہ ایک طرف تو اس کے لیے نپے تُلے چارے کا انتظام کیا جائے اور دوسری طرف سفلی جذبات کی تسکین کی اُسے پوری پوری آزادی مہیا کی جائے تاکہ وہ اس مادی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ چنانچہ شروع ہی سے ہمارے ہاں سیاسی اور معاشی میدان میں دو واضح رجحانات ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت سارے کام ڈنڈے کے زور سے کرے اور افراد کسی معاملے میں اپنے آپ پر کوئی ذمہ داری محسوس نہ کریں۔ حکومت اگر لوگوں کی فلاح و بہبود کی متمنی ہے تو اُسے چاہیے کہ ملک کے اندر شدید قسم کی جکڑبندیوں کے ذریعہ اس مقدس فرض کو سرانجام دے، کیونکہ اگر معاملہ انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تو وہ لازمی طور پر تخریبی کارروائیاں ہی کریں گے۔ دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک کے معاشی حالات کی بہتری کی بھی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ ملک کے ذرائع و وسائل براہِ راست حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور وہ خود پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت کا انتظام کرے، کیونکہ عام انسانی آبادی کو اگر اس معاملے میں آزادی دی گئی تو ملک میں منصفانہ تقسیمِ دولت کے بجائے چھین جھپٹ کا بازار گرم ہوگا اور کمزور طبقوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔

ہم اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ یہ منطق کس قدر غلط ہے اور اس میں کیا کیا فکری لغزشیں ہیں اور یہ طرزِ استدلال جن مفروضات پر قائم ہے وہ کس قدر بودے اور حقیقت سے دُور ہیں۔ مثلاً یہ دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ وہی انسان جو اپنی انفرادی زندگی میں سخت حریص، لالچی اور بندۂ نفس ہوں گے انہیں جب اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے اقتدار کی باگیں سونپ دی جائیں گی تو وہ انصاف اور بے غرضی کے پیکر بن جائیں گے اور اقتدار کا نشہ ان میں تکبّر اور خود غرضی پیدا کرنے کے بجائے انکسار اور بے نفسی کو جنم دے گا؟ ہم فی الحال ان سب پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کس قسم کے غلط رجحانات پیدا ہوگئے ہیں اور انھوں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کس قسم کے تباہ کن نتائج مترتب کیے ہیں۔

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر سب سے زبردست نقصان یہ پہنچا ہے کہ اسلام جو ہماری زندگی کی واحد اساس ہے وہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا ہے۔ دو چار افراد فی ہزار کو چھوڑ کر پوری مسلم آبادی زبان سے تو یہی اقرار کرتی ہے کہ اسلام ہی صحیح اور مکمل ضابطۂ حیات ہے مگر اس زبانی اقرار کے باوجود ہم فلاح و کامرانی کے لیے دوسرے نظاموں کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ہماری زندگی میں جو یہ خوفناک تضاد پیدا ہوگیا ہے اس نے ہماری تعمیری قوتوں کو بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور اس سے ہمارے اندر نفاق کا ایسا مرض پیدا ہوگیا ہے جس کی اصلاح کی کوئی صورت بجز اس کے نظر نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ غیب سے اس کا کوئی انتظام کر دے۔ اسلام کی مظلومیت کا یہ عالم ہے کہ خالص مادہ پرستانہ نظریات اور سو فیصد غیر اسلامی نظامہائے حیات کے علمبردار اسلام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نام پر اپنے ان خرافات کا پرچار کرتے پھرتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نام پر اب کفر کی علانیہ اشاعت کی جا رہی ہے۔ یہ صورتِ حال اس قدر افسوسناک ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس منافقت کے ساتھ آج تک دنیا میں کسی قوم کو ابھرنے بلکہ ابھرنا تو کیا زندہ رہتے نہیں دیکھا گیا۔ یہ منافقت جب کسی قوم میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر اُسے دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہے۔

دوسرا بڑا نقصان ہمیں یہ پہنچا ہے کہ ہماری قوم کے دل و دماغ میں یاس و قنوطیت چھا گئی ہے وہ اپنے آپ سے، اپنے ماضی سے، اپنی قیادت سے، اپنے مستقبل سے بیزار معلوم ہوتی ہے۔ اس چیز نے اس کے اندر نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور اُس کی خود اعتمادی کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اُسے نہ تو اپنے آپ پر اعتماد باقی رہا ہے اور نہ کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو آمادہ پاتی ہے۔ آپ کسی شخص سے بات کر کے دیکھیں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ ہر فرد یہاں بیزار بیٹھا ہے۔ عوام اس مرض کو معمولی سمجھتے ہیں حالانکہ اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ بڑا خوفناک مرض ہے جس سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان دل لگا کر کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر کام کو بیگار سمجھ کرتا ہے، ہر دوسرے آدمی کو بے ایمان سمجھتے ہوئے اس سے معاملہ کرتا ہے اور خود بھی تخریب پسندانہ ذہنیت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اُس کے اندر نہ کوئی تعمیری جذبہ باقی رہتا ہے نہ کوئی تعمیری قوت۔ اور دوسرا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر فطری طور پر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا اس کے لیے ہر کام کرے مگر وہ کسی کے لیے کچھ نہ کرے۔ یہی چیز اس کے اندر ایک آمرانہ نظام کی طلب اور اسے قبول کرنے کی کمزوری پیدا کر دیتی ہے، کیونکہ آمریت کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس کا دائرۂ اختیار بھی وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ صرف یہ وسیع اختیارات رکھنے والی طاقت ہی اُس کی زندگی کو بہتر اور شادکام بنا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں آمرانہ مزاج رکھنے والے افراد کے جو اس قدر حوصلے بڑھے ہیں کہ وہ عوام کی منشا اور مرضی کے علی الرغم تختِ اقتدار

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

© rasailojaraid.com